مولانا محمد طاسین کی تحریر کے جواب میں

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب
استاذ حدیث دار العلوم حقانیہ

اُدھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

(نقد اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا شرعی تجزیہ)

یہ مضمون درحقیقت "حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ" کے اس مضمون کا تجزیہ اور تفصیلی جائزہ ہے جو مجلہ "الحق" کے جلد ہذا کے شمارہ ۳-۴ میں "ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ قبل ازیں حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کا وقیع مضمون بھی "الحق" کے حوالہ سے بطور جواب قارئین کی نظر سے گذرا ہوگا، جس میں کافی حد تک زیر بحث مسئلہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔

اوّل الذکر مضمون نگار کی اسلامی اور جدید معاشیات پر عمیق نظر اور متعلقہ فن میں وافر معلومات رکھنے سے کسی کو انکار نہیں، موصوف ملک کے ان چند گنے چنے شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، جن کو اہل نظر، جدید معاشی نظام میں اسلامی نظام معیشت کا وکیل سمجھتے ہیں۔ آپ کی علمی کاوشیں "مجلس علمی" میں ادبی اور ریسرچ و تحقیق کے میدان میں مسلم ہیں بایں ہمہ ممکن ہے کہ موصوف کی زیر بحث مسئلہ میں رائے وقتی مصلحت یا مروّجہ حالات و واقعات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے موزوں ہو۔ لیکن شرعی نقطہ نظر سے موصوف کے اٹھائے ہوئے نکات قابل توجہ نہیں بلکہ محل نظر ہیں۔ موصوف کی رائے کہ ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی حرام اور ناجائز ہے، کے تجزیہ سے قبل ہم قرآن و حدیث کے حوالہ سے مسئلہ کا ایک طائرانہ مطالعہ کر کے داخلی اور خارجی قرائن کی رو سے اس کا جائزہ لیں گے۔ لیکن اس سے قبل مسئلہ کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تاکہ قارئین کسی الجھن اور غلط فہمی کے شکار نہ ہوں۔

قدیم معاشرہ کے مطالعہ سے قطع نظر مروجہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی ایسے معاشی پہلو میں جکڑی ہوئی ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی کسی ضروری چیز کی یکمشت خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو اپنی قوت برداشت کو مدنظر رکھ کر ماہانہ یا سالانہ قسط وار خریدنے پر تیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بائع نقد گاہک یعنی یکمشت زر بیع ملنے کی صورت میں ادھار پر فروخت کرنے کے لیے بہت کم آمادہ ہوگا۔ (معاملات میں تقوی اور دیانت داری کی بات اگرچہ اس سے الگ ہے) کیونکہ ادھار کی صورت میں اس کی مالی منفعت لازمی طور پر متاثر ہوگی۔ اس لیے بائع کو آمادہ کرنے کیلئے

قیمت فروخت میں نقد کی نسبت سے کچھ زیادتی رکھی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر نقد کی حالت میں اس چیز کی قیمت کھلی مارکیٹ میں ایک سو روپے ہو تو ادھار کی وجہ سے اس کی قیمت ایک سو بیس روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ بائع کے لیے ادھار کی وجہ سے قیمت میں بیس روپے کا یہ اضافہ وصول کرنا یا مشتری کے ایسے معاملہ کے ارتکاب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ میرے ناقص خیال میں دوسرے عام فہم مسائل کی طرح اس کا جواب بھی نہایت آسان دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ موصوف کے علمی و تحقیقی مزاج اور باریک بینی نے اس کو ایک نظری اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیا۔

آسان اور سہل ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اٹھانوے فیصد فقہ حنفی کے مقلد ہیں۔ شاید ملک کے طول و عرض میں "تبحر فی العلم" والے حضرات بہت کم تعداد میں ہوں۔ لیکن مجتہدین فی الشرع، فی المذہب، فی المسائل کے رتبہ تک پہنچنے والے درکنار اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح کے پایہ کا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ ایسے علمی انحطاط کے حوالہ سے ہمیں سیدنا امام ابوحنیفہؒ یا اس کے مذہب کے مسلمہ قواعد و ضوابط کی رو سے مسلک کے ذیلی مجتہدین میں سے کسی ایک کے فرمودہ پر اعتماد کر کے اصل مراجع یعنی آیت یا حدیث کے مطالبہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ایسے نازک مرحلہ پر طبقہ ثالثہ کے سرخیل علامہ سرخسیؒ یا طبقہ خامسہ کے نامور فقیہہ صاحب ہدایہ کے قول پر بغیر کسی تاویل کے اعتماد کرنا ہمارا فریضہ منصبی ہے۔

قدیم فقہی ذخائر میں کسی واضح جزئیہ کے میسر ہونے کے باوجود اصل مراجع قرآن و حدیث سے کسی دلیل کا مطالبہ کرنا درحقیقت مجتہدین کا کام ہے۔ اس لیے موصوف کا یہ تمہیدی بیان اکابرین امت کی رائے سے موافقت نہیں رکھتا کہ

> "کسی معاملہ کے شرعی جواز و عدم جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بنا پر اس فقیہہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے"۔[1]

مقلد کی ذمہ داری

میرے خیال میں مقلد کو تسلیم و رضا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ورنہ شاید ایسے بے موقعہ لب کشائی سے اپنے مذہب و مسلک پر بدگمانی کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔

تیرھویں صدی کے نامور فقیہہ علامہ ابن عابدین اصول افتا کے ضمن میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فاقول ان هذا الشرط (اعني لا يحل ان يفتي بقولنا حتى يعلم من اين قلنا) كان في زمانهم اما في زماننا فيكتفي بالحفظ كما في

ترجمہ: میرے خیال میں امام ابوحنیفہؒ کے قول "کہ ہمارے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک اصل مرجع معلوم نہ ہو" کا اشتراط ان کے دور میں تھا۔ ہمارے وقت میں

[1] ماہنامہ الحق ج ۲۷ شمارہ ۳ ص ۲

القنیة وغیرھا فیحل الافتاء بقول الامام بل یجب وان لم من این قال[1]

محض مذہب کی جزئیات پر فتوی دینا صرف جائز نہیں بلکہ واجب ہے اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ امام نے کس دلیل کی روشنی میں یہ بات کہی ۔

مقلد بن کر دلیل کا مطالبہ کرنا مقلدین کا کام نہیں بلکہ مجتہدین کا کام ہے ۔جیساکہ فرماتے ہیں ۔

ولا شک ان ھذا خاص بالمفتی المجتھد دون المقلد المحض فان التقلید ھوالاخذ بغیر معرفة دلیل[2]

ترجمہ:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیل کا مطالبہ کرنا مجتہد کا کام ہے ۔ اور مقلد کے لیے تو بغیر دلیل کے مطالبہ کرنے کے صرف جزئیہ پر عمل کرنے سے اور کوئی چارہ نہیں ۔

دلیل کے مطالبہ کی حقیقت

کیونکہ دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ متعلقہ مسئلہ میں صرف آیت یا حدیث کا اجمالی تذکرہ ہو ۔ اور نہ ایسے شخص کے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے اجمالی علم کارآمد ہے جو ابتداء ہی سے فقہی اقوال پر قناعت کا نظریہ نہ رکھتا ہو ۔ بلکہ دلیل کا مطالبہ کرتے وقت اس میں مذہب ومسلک کے قواعد وضوابط کی رو سے طریقہ استدلال اور پھر داخلی وخارجی قرائن کے حوالہ سے پرکھنے کی صلاحیت ضروری ہے اور متعلقہ مسلک کے جملہ مسائل پر علم بھی ضروری ہے تاکہ سیاق وسباق کے حوالہ سے مسئلہ پر پورا علم رکھے ۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی علمی بصیرت اس معیار پہ پہنچی ہوئی ہو تو تقلید کی جگہ یہ خود مجتہد بننے کا حقدار ہے پھر اس کو تقلید کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی جیساکہ موصوف مزید فرماتے ہیں ۔

لان معرفة الدلیل انما تکون للمجتھد لتوقفھا علی معرفة سلامته من المعارض وھی متوقفة علی استقراء الادلة کلھا ولا یقدر علی ذلك الا المجتھد اما مجرد معرفة ان المجتھد الفلانی اخذ الحکم الفلانی من الدلیل الفلانی فلا فائدہ فیھا[3]

ترجمہ:۔ دلیل کی پہچان مجتہد کا وظیفہ ہے کیونکہ اس کے لیے دلیل کا معارضہ سے محفوظ ہونیکا علم ضروری ہے ۔ جس کے لیے جملہ دلائل کا استقرا ضروری ہے اور اس پر مجتہد کے سوا اور کوئی قادر نہیں تاہم محض یہ جاننا کہ فلاں امام نے فلاں دلیل سے یہ حکم لیا ہے ۔ کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں ۔

ہم تو مقلد ہیں ۔ ہمارے لیے صاحب ہدایہؒ یا علامہ سرخسیؒ کا جزئیہ درکنار بلکہ محض حضرت تھانویؒ ،

[1] شرح عقود رسم المفتی ص۲۲ ۔ [2] ایضاً [3] شرح عقود رسم المفتی ص۴۲ ۔

مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہٗ، مفتی کفایت اللہؒ اور فقیہہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد دامت برکاتہم کی رائے بھی حرف آخر ہے۔ ہم تقلید کے حوالہ سے ان ائمہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے اصل مراجع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن موصوف اور زیر بحث مسئلہ میں آپ کے ہمنوا حضرات کی تسلی کے لیے اپنے طالب علمانہ مطالعہ کے حوالہ سے چند حوالہ جات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ قارئین پر واضح ہو کہ فقہاء کا یہ مسئلہ ذاتی اختراع یا تقدیہ نہیں بلکہ اس کی تائید میں منصوص واقعات، آیت اور حدیث بطور استناد کے موجود ہیں۔

زیر نظر مسئلہ میں قیمت میں زیادتی کی حقیقت

اس کی پوری حقیقت تو انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ چل کر موصوف کے مضمون کے تجزیہ کے بعد واضح ہوگی۔ کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں یہ تفاوت کیا ادھار کا عوض ہے یا ادھار کی وجہ سے ہے۔ دونوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تاکہ منصوص حرام و ناجائز کاروبار "ربوا النسیہ" سے اس کا فرق ہو سکے۔ سردست ہم یہ مقدمہ رکھ کر دلائل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں یہ تفاوت ادھار کا معاوضہ نہیں حقیقت میں ایسا کبھی نہیں کہ زر بیع میں کچھ قیمت بیعہ کی ہے۔ اور کچھ قیمت اس اجل کی ہے تاکہ بوقت ضرورت کوئی ایک دوسرے سے الگ ہو سکے بلکہ معاشرتی اور واقعاتی نظائر و حالات کو مدنظر رکھ کر نقد میں ادھار کی نسبت منافع، فوائد اور دوسری خرابیوں کی فراوانی کی وجہ سے کچھ زیادتی آتی ہے۔ ہم آسانی کے لیے اسے یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ "ان الزیادہ ھھنا لاجل الاجل لا لعوض الاجل" یعنی "یہاں پر زیادتی ادھار کی وجہ سے ہے۔ ادھار کے عوض میں نہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کے متعدد نظائر پائے جاتے ہیں جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آتی ہے۔ بلکہ صحابہ کرامؓ کے بعض واقعات عملی طور پر اس کے شواہد ہیں۔

قرآن سے استدلال

قرآن مجید کی "آیت المداینہ" پر سوچ و فکر کرنے سے شاید اس حقیقت شناسی کے لیے مواد مل سکے۔ کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں تفاوت جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے۔

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک کیے ہوئے عقد سلم کے معاملہ کو اپنی کتاب میں "یاایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ الایہ" کی رو سے حلال قرار دیکر اجازت دی ہے[1]

اور حضرت ابن عمرؓ بھی فرماتے ہیں:-

لاباس بالطعام الموصوف بسعر معلوم الی اجل معلوم[2]

ترجمہ:- مقررہ مدت تک مقررہ نرخ پر معلوم غلہ کے کاروبار میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] التفسیر المظہری ج ۱ ص ۴۴۴ [2] بخاری شریف ج ۱ ص ۳۰۰

معلوم ہوا کہ آیت مداینہ بنیادی طور پر "عقد سلم" کے بارے میں ہے۔ اور عقد سلم کی تعریف علماء نے یوں کی ہے۔

"بیع اجل بعاجل"[1]

اس اجمال کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی مشتری مقررہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے مثلاً کسی شخص کو ایک ہزار روپے دے کر یہ معاہدہ کرے کہ یہ رقم پیشگی وصول کر کے فلاں وقت مجھے گندم اس نرخ کے اعتبار سے دینے کے پابند رہو گے اور بائع بھی مقررہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے رقم وصول کر کے معاہدہ قبول کرے تو اسے "عقد سلم" کہا جاتا ہے خیر القرون کے دور سے لے کر آج تک بغیر کسی انکار کے یہ معاملات جائز اور مشروع ہیں۔ "عقد سلم" کی ماہیت پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں۔ کہ مشتری وقتی طور پر یکمشت زر سلم کی ادائیگی پر تیار ہو کر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کے لیے انتظار کس جذبہ کے تحت کرتا ہے؟ کیا اس کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا کوئی حسین جذبہ کارفرما ہے؟ کبھی نہیں۔ اگر خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تو قرضہ حسنہ کی صورت میں بائع سے اس آڑے وقت میں تعاون کا ہاتھ بڑھا دیتا۔ متعدد شرائط کی رعایت کر کے پیشگی رقم دے کر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کے انتظار کرنے سے بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بارگراں کے تحمل کے عوض اس کو مقررہ وقت پر مبیعہ ارزاں قیمت پر میسر ہو کیونکہ عقد سلم میں مبیعہ بازار کی قیمت سے بائع کو عموماً سستا پڑتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی عقد سلم کی مشروعیت میں اس فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

انما ابیح علی خلاف القیاس رفع	عقد سلم خلاف القیاس ہونے کے باوجود اس وجہ
حاجة الفقیر حالا عن نفقة عیاله	سے جائز قرار دیا کہ اس میں بائع اپنی خستہ حالی میں
القادر علی المسلم فیه مالا۔ وحاجة	بچوں کے لیے خرچہ کا بندوبست کر کے مستقبل
المشتری الی الاستبرباح لعیاله	میں اس کی ادائیگی پر قادر ہو کر عہدہ برآں ہو سکتا
وهو بالسلم اسهل اذ یکون	ہے جبکہ مشتری کو سلم میں فائدہ زیادہ ہوتا ہے
المبیع فی السلم نازلا عن قیمته	کیونکہ عموماً عقد سلم میں قیمت مروجہ قیمت سے
فی البیع غالبا[2]	ارزاں ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ عقد سلم میں زر بیع کی پیشگی ادائیگی اور مبیعہ کی تاخیر سے قیمت کی مارکیٹ متاثر ہوئے بغیر نہ رہی عقد سلم میں ادھار یعنی نسیہ لازمی شرط ہے۔ اگر اس میں ادھار نہ ہو تو سلم کی حقیقت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا جب "بیع عاجل بعاجل" میں نسیہ اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا آنا ممنوع نہیں۔ سود کے زمرہ میں نہیں آتا تو زیر نظر معاملہ یعنی ادھار میں جو "بیع عاجل بآجل" کی مخصوص صورت میں قیمت کا تفاوت کیوں ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔

---

[1] فتح القدیر ج ۶ ص ۲۰۴ [2] التفسیر المظہری ج ۱۰ ص ۴۱۵

پیش نہ کیا جائے کہ عقد سلم خلاف القیاس وارد ہو کر اس پر دوسرا معاملہ قیاس نہیں کیا جاتا کیونکہ عقد سلم غیر موجود مبیعہ کی فروخت کے جواز کی حیثیت سے خلاف القیاس ہے نہ ہم اس پر کوئی قیاس کرتے ہیں بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نقد اور ادھار میں مبیعہ یا ثمن کا متاثر ہو کر کمی یا زیادتی کا آنا شروع معاملہ ہے ربوا بالنسیئہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عملی واقعہ سے استدلال

نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آنے کے جواز کی نشاندہی ایک روایت سے بھی ہو سکتی ہے جس کا تعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے ہے۔ امام بخاری ؒ نے " باب شراء النبی ص بالنسیئہ " کے عنوان سے باب باندھ کر یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر نقد کی طرح بعض اوقات ادھار سے ضروریات زندگی خریدیں۔ آپ نے اس میں حضرت عائشہ رض کی روایت لائی ہے جس میں آپ فرماتی ہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتری	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے کچھ
طعاما من یھودی الی اجل ورھنه	غلہ ادھار پر خریدا اور اپنا لوہے کا ایک بنا ہوا
درعا من حدید له	درہ رہن میں رکھا۔

امام بخاری ؒ نے یہ روایت متعدد بار مختلف مسائل میں نقل کی ہے اس لیے نسیئہ پر معاملہ کا جواز ناقابل انکار حقیقت ہے۔ موصوف بھی اپنے مقالہ کی ابتداء میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے۔ قرآن و حدیث کی رو سے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں۔ جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جیسے دوسرے معاملات کے مطالعہ سے قطع نظر ہم یہودی سے مذکورہ معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک متعصب دشمن اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اور پھر اس کے بعد روزمرہ ضرورت آنے والی چیز " درع " کو رہن کرنے کے پس پردہ واقعات کے جائزہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اس میں نظر مسئلہ کے جواز کے لیے قوی مستدل موجود ہے۔ اس پس پردہ حقیقت جاننے کے لیے ہمیں اس واقعہ کا مطالعہ مدینہ منورہ کے معاشی حالات کو مد نظر رکھ کر کرنا ہوگا۔

---

[1] بخاری ج ۲ صـ ۲۷۶ [2] الحق ج ۲۷ شمارہ ۳ صـ ۲۲

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہو تو اس کا گاہک بھی زیادہ ہوتا ہے اور جب خریدار زیادہ ہوں تو اس چیز کے بدلنے کے مواقع وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں ایسے وقت میں بائع نسیہ کی نسبت سے نقد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے الا یہ کہ نسیہ میں اگر کہیں مالی منفعت بہ نسبت نقد کے زیادہ ہو تو پھر صوابدید پر فیصلہ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ کے وقت مدینہ منورہ کی معاشی حالت کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مدینہ منورہ میں غلہ کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ عموماً لوگوں کو بیرونی قافلوں کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ اور جب کبھی قافلہ آنے کی خوشخبری سنائی جاتی تو فاقہ زدہ معاشرہ کی حالت بسا اوقات غیر ہو جاتی اور اپنی جان کی خبر تک نہ رہتی۔ چنانچہ ایک دفعہ جب صحابہ کرام کو قافلہ آنے کی خبر اس وقت پہنچی جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے تو صحابہ کرام کی کثیر تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے چھوڑ کر قافلہ کی طرف دوڑ پڑے جس پر سورہ الجمعہ کی آخری آیتیں نازل ہوئیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ خرید و فروخت کی مارکیٹ پر یہودی چھائے ہوتے تھے وہ قافلہ سے غلہ خرید کر بعد میں من مانی قیمت پر فروخت کرتے تھے ان کو نقد کا گاہک ایسی ضرورت کی اشیاء میں لازمی طور پر میسر تھا۔ یہ لوگ نقد کی نسبت ادھار کو ترجیح کسی شوق کی وجہ سے نہیں دیتے۔ بلکہ مالی منفعت کی خاطر یہ لوگ ادھار کا معاملہ کرتے۔ ایسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھار کے معاملہ سے غالب گمان ہے کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں قیمت کا تفاوت لازمی طور پر اختیار کیا گیا ہو ورنہ یہودی کو نقد کے گاہک ملنے کے باوجود ادھار کا معاملہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ مالی منفعت اور زیادہ قیمت کی وصولی کے سوا یہودی کے اس اقدام کے لیے اور کوئی دوسرا محرک نظر نہیں آتا۔

اس میں اس کا احتمال بھی نہیں کہ یہودی نے کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض احسان کے جذبہ سے حسن سلوک کر کے محض نقد کی قیمت پر بطور ادھار دیا ہو۔ کیونکہ " لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا " کے صریح ہونے کے باوجود یہودیوں جیسی متعصب قوم سے مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر سرور دو عالم سے خیر خواہی، حسن سلوک اور مواسات کے جذبات کی توقع کرنا بے سود ہے۔ بلکہ حدیث میں " ورہنہ درعہ " کے الفاظ سے بھی خیر خواہی کے جذبہ کی تردید ہو رہی ہے آخر کار جب ہمدردی مقصود تھی تو آپ سے توثیق کے لیے رہن کا مطالبہ کیوں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی درع بطور رہن رکھنے کے لیے کیسے تیار ہوتے جو آپ کی مجاہدانہ زندگی کی روزمرہ ضرورت تھی۔

یہ ایسے امور ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں نسیہ کی صورت میں نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی گئی ہو۔

خیر القرون میں زیر بحث مسئلہ کا عملی ثبوت

مذکورہ شہادات کے علاوہ صحابہ کرام کی زندگی میں ہمیں ایسا واضح غیر مبہم اور ٹھوس ثبوت ملتا ہے۔ جس سے مسئلہ کی شرعی حیثیت خود بخود واضح ہوتی ہے کہ اس کے جواز میں صحابہ کرام کے دور میں کوئی خلاف نہیں تھا اور صحابہ کرام خود ایسے معاملات کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ اور زید بن ارقم کے واقعہ میں اس کی صریح دلیل ہے۔ امام احمد کی روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سیدنا امام ابوحنیفہ رحؒ کے واسطہ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان امراۃ قالت لعائشۃ رضؓ ان زید بن ارقم باعنی جاریتہ بثمانمائۃ درھم ثم اشتراھا منی فقالت ابلغیہ عنی ان اللہ قد ابطل جھادہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لم یتب الیہ[1]

ترجمہ:۔ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضؓ سے عرض کی کہ زید بن ارقم نے مجھ پر ایک لونڈی آٹھ سو روپے پر فروخت کر کے دوبارہ چھ سو روپے پر خریدی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا میری طرف سے زید بن ارقم کو یہ پیغام پہنچا دو۔ اگر اس نے اپنے اس کئے ہوئے کام سے توبہ نہ کی۔ تو اللہ تعالیٰ اس کا وہ جہاد ضائع کر دے گا جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں کیا ہے۔

اگرچہ اس روایت میں نقد اور نسیہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن مسند احمد کی روایت میں اس پر یہ اضافہ آیا ہے۔

انی بعت من زید غلاما بثمانمائۃ درھم نسیئۃ واشتریتہ بستمائۃ نقدا[2]

ترجمہ:۔ کہ میں نے اس سے آٹھ سو روپے ادھار پر غلام خرید کر چھ سو روپے نقد پر دوبارہ اس پر فروخت کی ہے۔

اس روایت کو دیکھ کر میرے خیال میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ زید بن ارقم کے اس معاملہ میں نقد کی قیمت اگرچہ سو روپے ہے تو ادھار کی قیمت آٹھ سو روپے مقرر کی جا رہی ہے۔

شاید اس پر کسی کو شبہ ہو، ممکن ہے کہ یہ حضرت زید بن ارقم کا انفرادی عمل ہو۔ دوسرے صحابہؓ آپ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے اس پر مطلع ہو کر بہت سخت الفاظ میں پیغام بھیجا کہ اگر اس نے اپنے کئے ہوئے کام سے رجوع نہ کیا۔ تو اس کا جہاد جیسا مبارک عمل ضائع ہو گا گویا آپ نے یہ اقدام گناہ کبیرہ سمجھ کر دوسرے اعمال کے لیے مبطل قرار دیا۔

---

[1] فتح القدیر ج ۶ صـ [2] فتح القدیر ج ۶ صـ

لیکن یہ شبہ بے بنیاد ہے کیونکہ یہاں پر حضرت زید بن ارقم کے اس معاملہ میں دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ نقد اور نسیہ کی قیمت میں آپ نے تفاوت رکھا دوسری چیز یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فروخت کئے ہوئے غلام یا لونڈی کو دوبارہ کم قیمت پر قبل نقد الثمن خرید کر بظاہر سودی معاملہ کا ارتکاب کیا حضرت عائشہ رضؓ کے انکار کا تعلق اول الذکر مسئلہ سے نہیں بلکہ اتنی شدت سے انکار آپ نے دوسرے معاملہ کو مدنظر رکھ کر کیا۔ آپ نے یہ ربوا کی ایک ذیلی شکل قرار دیکر اس پر ربوا کی آیت تلاوت کی پھر ربوا کا تعلق بھی اوّل معاملہ سے نہیں تھا۔ یعنی نسیہ میں اس چیز کی قیمت اٹھ سو روپے مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اگر صرف یہ عقد ہوتا تو اس پر انکار کی گنجائش نہ رہتی لیکن دوسرے معاملہ میں کہ اپنی فروخت کی ہوئی چیز کو قبل نقد الثمن کم قیمت پر خریدنے میں سودی عناصر نظر آرہے تھے۔ اس لیے آپ نے انکار کیا اور پہلا معاملہ بھی اس اعتبار سے درست نہ رہا۔ کہ دوسرے حرام معاملہ کی پوری عمارت اس پر بنی ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت عائشہ رضؓ نے دونوں پر انکار کرکے فرمایا کہ بری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی جلال الدین الخوارمی اس تفرقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وانما ذمت البیع الاول وان کان	آپ نے پہلے بیع کی مذمت بھی کی۔ حالانکہ یہ
جائزا عندھا لانھا صارت ذریعۃ	آپ کے ہاں بھی جائز معاملہ تھا کیونکہ یہ دوسرے
الی البیع الثانی ھو موسوم بالفساد[1]	ناجائز اور فساد عقد کے لیے ذریعہ تھا۔

یہی وجہ ہے آپ کے کلام میں "بئس ما شریت واشتریت" بری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی" عقد ثانی باعتبار وجود متوخہ ہونے کے باوجود آپ نے ذم کرتے ہوئے پہلے ذکر کیا کیونکہ بنیادی طور پر اس کی مذمت مقصود تھی۔

حضرت زید بن ارقم کے اس تفاوت پر اقدام اور حضرت عائشہ رضؓ کا تفاوت پر خاموشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادھار کے معاملہ میں قیمت کا تفاوت خیر القرون کے معاشرہ میں بھی مروج تھا اس پر کوئی انکار نہیں کر رہے تھے۔ اور نہ کسی نے اس کو "ربوٰ النسیئۃ" میں شمار کیا۔ (جاری ہے)

---

[1] الکفایہ علی الہدایہ، فتح القدیر ج ۶ صـ۷